جناب پروفیسر اظہار الحق *

ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوام زندگی!

مارچ ۱۹۷۷ء میں میٹرک کے امتحان سے فراغت کے فوراً بعد حضرت والد مرحوم نے دینی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ شروع کرنے کے لئے اکوڑہ خٹک جانے کا مشورہ دیا۔ان کے مشورے کو حکم سمجھتے ہوئے دوسرے دن ان کے ساتھ چل کر ابتدائی کتب کی بسم اللہ ہوئی ۔اور یوں ۸ سال کے درس نظامی کی وادی میں پہلا قدم رکھا۔ رفتہ رفتہ طلبہ اور اساتذہ جامعہ اسلامیہ' جامعہ حقانیہ سے شناسائی بڑھتی گئی ۔طلبہ تو میرے ہم عمر اور اور اکثر میرے ہم سبق تھے۔اور دونوں جامعات کے اساتذہ کرام سے تعلق تو وضاحت کا محتاج نہیں۔مگر ایک ابراہیم فانی مرحوم تھے جو نہ تو میرے ہم سبق اور ہم عمر تھے اور نہ میرے اساتذہ کرام کی صف میں شامل تھے۔مگر فارغ اوقات کا زیادہ حصہ میں ان کے ساتھ گزار کر ان کی محفل سے محظوظ ہوتا تھا۔اور پھر یہ تعلق ان کے سفر آخرت تک جاری رہا مجھے وہ دن بھی اچھی طرح یاد ہے' جب فانی صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اور اب وہ دن بھی دیکھنا پڑا جب وہ سفر آخرت پہ جا رہے تھے۔

پستہ قد' سرخ گندمی رنگ' چہرے پہ ایک دائمی مسکراہٹ' شعروادب کا دلدادہ' مہمان نواز' خاکسار' علم و ادب سے وابستگی' ذہین وفطین اور خود دار ادیب وعالم کے طور پر جانے پہچانے جاتے تھے۔میری ان کے ساتھ رفاقت کی دو تین خاص وجوہات تھیں۔ایک یہ کہ میرے والد مرحوم شیخ الحدیث حضرت مولانا فضل الٰہی ایک عرصے تک اکوڑہ خٹک کے دونوں جامعات (جامعہ اسلامیہ اور جامعہ حقانیہ) میں درس و تدریس کے منصب پر فائز رہے۔اور فانی صاحب کے والد مرحوم حضرت مولانا عبدالحلیم (صدرِ المدرسین) بھی دارالعلوم حقانیہ کے شیوخ میں نمایاں مقام رکھتے تھے ہم دونوں کا تعلق بھی ایک علاقے ضلع صوابی سے تھا۔ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں تقریباً پانچ سال (۱۹۷۷۔۱۹۸۲) تک مجھ پر غزل گوئی کا بت سوا رتھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۷۷ء میں جب میں نے پشتو کی پہلی غزل لکھی تو میں نے وہ غزل اپنے ایک قریبی رشتہ دار مولانا فضل حق ممتاز اور فانی صاحب کو اصلاح کے لئے دے دی تو دونوں نے خوب حوصلہ افزائی فرمائی ۔مولانا فضل حق ممتاز مرحوم

---

* گورنمنٹ ڈگری کالج چھوٹا لاہور' صوابی

واپس کراچی چلے گئے اور یوں میں بذریعہ خط ان سے اور بالمشافہ فانی صاحب سے شعر وشاعری کے میدان میں مستفید ہوتا رہا۔

مولانا فضل حق ممتاز مرحوم (جو رشتہ میں میرے چچا لگتے تھے) خود بھی اعلیٰ پائے کے شاعر اور عالم تھے اور فانی صاحب کے ساتھ میری رفاقت کی ایک وجہ ان دونوں کی آپس کی گہری دوستی بھی تھی۔ ایک دن بذریعہ ڈاک مولانا فضل حق مرحوم کا میرے نام ارسال کردہ خط مجھے ملا۔ خط میں ایک شعر کے مصرع کو 'طرحہ' بنا کر کراچی کی کسی پشتو ادبی مجلس میں شعراء کو طبع آزمائی کیلئے پیش کیا گیا تھا۔ خط میں مولانا مرحوم نے مجھے اور فانی صاحب کو بھی طبع آزمائی کا مشورہ دیا تھا۔ مصرع یہ تھا "سترگے مِی دہ یار دی کہء مزار کبنی ڈیوے بلے دی"

فانی صاحب نے تو دو ایک دن کے بعد مذکورہ طرح پر ایک اچھی غزل مجھے لکھ کر سنادی۔ میرے چچازاد بھائی مفتی رضاء الحق صاحب نے بھی اس کو غزل کی شکل دی۔ میں بھی خریداران یوسف میں شامل ہوا۔ مجھے ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ طرحہ کے مصرعے پر یہ دوسرا مصرع ہم تینوں میں کس نے لکھا تھا؟

"سترگے مہ دہ یار دی کہء مزار کبنی ڈیوے بلے دی
نہ یمہ شاعر خو دہ یار سترگو کبنی غزلے دی

بہر حال دو تین اور میری غزلیں مکمل ہوئیں' تو اتفاقاً فانی صاحب سے ملاقات کے دوران انہوں نے حمزہ شنواری کی بیماری اور محمدی ہسپتال پشاور میں زیرعلاج ہونے کی بری خبر سنائی۔ ان کی بیمار پرسی کے لئے پشاور جانے کا پروگرام بنا اور یوں حمزہ شنواری مرحوم سے ملاقات کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ یہ شعراء بھی عجیب بادشاہ لوگ ہوتے ہیں' ان کی شاعری سے اپنی اولاد جیسی محبت ہوتی ہے۔ حمزہ صاحب کو دل کا عارضہ لاحق تھا۔ ہسپتال کے بستر پر تھے مگر اس وقت بھی انہوں نے فانی صاحب کی وجہ سے میری ایک غزل کو خوب سراہا۔

۵ سال تک شعر وغزل کا شغف دیوانگی کی حد تک تھا۔ مگر بعد ازاں پتہ نہیں کیوں؟ شاعری کا وصف مفقود ہوگیا۔ تاہم فانی صاحب اور دیگر جہاں کہیں ملتے ان سے ضرور کچھ نہ کچھ سنتا اور یہ ذوق تاحال جوان ہے۔

۱۹۸۵ء میں دارالعلوم حقانیہ سے فراغت کے بعد میں نے صوبہ سرحد کے کالجز میں تدریس کا شعبہ اپنایا اور یوں فانی صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ کم تر ہوتا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں میرا تبادلہ لاہور کالج سے نوشہرہ کالج چار ماہ کے لئے ہوا۔ حضرت والد صاحب دارالعلوم حقانیہ میں دو کمروں پر مشتمل گھر میں رہائش پذیر تھے۔ میں نوشہرہ کالج سے دارالعلوم حقانیہ آجایا کرتا تھا اور یوں فارغ اوقات میں فانی صاحب سے ایک بار پھر ایک

باقاعدہ رابطہ قائم ہوگیا۔ اکثر ان کی بیٹھک میں اور خصوصاً بعد از نماز عصر تا مغرب دریائے کابل کی طرف واک کے دوران ان کی شاعری اور علمی وادبی باتوں کو سنتا رہتا۔

فانی صاحب بڑے بے تکلف انسان تھے' میں نے کبھی بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ دارالعلوم حقانیہ کے کسی اعلیٰ پائے کے استاد سے مخاطب ہوں یا اپنے سے ۸ سال بڑی عمر کے کسی انسان سے' فانی صاحب بڑوں کے ساتھ بڑے اور چھوٹوں کے ساتھ ..... گویا اس حدیث کے مصداق تھے۔من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا' ان کی اعلیٰ ظرفی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے کبھی بھی مجھے نام سے نہیں پکارا۔ ہمیشہ مجھے صاحب حق صاحب اور میں انہیں فانی جان کے الفاظ سے مخاطب کرتا تھا۔

جنوری ۱۹۹۳ء میں میرا تبادلہ واپس لاہور کالج ہوگیا۔ اور یوں پھر ہمارے رابطے کمزور ہوگئے۔ تاہم یہ رابطہ کہ کبھی میں دارالعلوم حقانیہ اور کبھی فانی صاحب شاہ منصور تشریف لاتے تھے۔ مرض موت تک بحال رہا۔ اللہ کی شان دیکھئے ۱۲/اپریل ۲۰۰۸ء میں مَیں اور مولانا ادریس چیئرمین امہ ویلفیئر ٹرسٹ کہیں جارہے تھے۔ راستے میں مولانا نے فانی صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ حیرت ہوئی کہ مولانا ادریس اور فانی صاحب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ مگر بعد ازاں معلوم ہوا کہ مولانا ادریس کی ان سے ۱۹۸۵ء میں ایک ملاقات ہوچکی تھی۔ مولانا نے بتایا کہ مفتی نظام الدین شامزئی مرحوم میرے استاد اور مخدوم تھے۔ حضرت فانی صاحب کی شاعری سے اتنے متاثر تھے کہ اکثر سفر کے دوران وہ فانی صاحب کی شاعری سناتے اور ہم سنتے جاتے۔ فانی صاحب کی شاعری کا ایک قابل ذکر حصہ ان کو ازبر تھا۔ یوں غائبانہ فانی صاحب کے نام اور کام سے تو میں واقف تھا۔ ۱۹۸۵ء کے دورہ حدیث کے وفاق کے امتحان کے لئے پہلی بار حضرت مفتی شامزئی مرحوم ممتحن کے طور پر دارالعلوم حقانیہ تشریف لائے' مولانا ادریس کے بقول حضرت شامزئی صاحب مرحوم کے ساتھ مہمان خانے میں ۶ دن تک مستقل رہنے والا خادم میں ہی تھا۔ اور یوں حضرت کی محفل میں فانی صاحب سے مولانا ادریس کی پہلی ملاقات ہوچکی تھی۔ پھر اس کے بعد حضرت فانی صاحب مرحوم کی امہ اور مولانا ادریس کے ساتھ آخری دم تک پکی یاری ہوگئی۔ یہاں تک کہ مرض الوفات کا جب فانی صاحب پر حملہ ہوا تو مولانا ادریس اتفاقاً انگلینڈ سے اسی دن پاکستان تشریف لائے تھے۔ جب مولانا ادریس کو پتہ چلا کہ فانی صاحب بیمار اور گاڑی کے انتظار میں ہیں تو انہوں نے امہ ویلفیئر ٹرسٹ کی ایمبولینس بھیج کر پشاور لے گئے۔ یوں یہ گویا تیسرا مرحلہ تھا جب مولانا ادریس کی وساطت سے فانی صاحب مرحوم سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ فانی صاحب مرحوم چونکہ نثر کے بھی اچھے لکھاری تھے' یوں میری درخواست پر امہ چلڈرن اکیڈمی

کے ماہنامہ ''پیام حق'' کے لئے ایک عرصے تک حرف آغاز لکھتے رہے۔

فانی صاحب کی آواز وانداز میں بلا کی تاثیر تھی' گفتار وکردار کے آدمی تھے' بولنے پہ آتے تو بڑے بڑے لوگ ہمہ تن گوش ہو جاتے' کشمیری حافظہ تھا' موقع اور محل کے مطابق عجیب وغریب واقعات اور عربی فارسی اشعار سناتے۔تحریر کے میدان میں قدم رکھتے تو قلم کا جادو چلتا اور اپنے ہاتھ سے ایسا خط لکھ جاتے کہ اسکے سامنے کمپیوٹر کا نستعلیق شرما جاتا۔ دارالعلوم حقانیہ کی اکثر اسناد حدیث کی خالی جگہوں میں فضلاء کے نام وغیرہ حضرت فانی صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔

دارالعلوم حقانیہ کے اساتذہ کرام' شیوخ عظام اور خصوصاً حضرت مولانا سمیع الحق صاحب' مولانا انوارالحق صاحب حضرت شیخ مغفور اللہ مدظلہ اور حضرت والد مرحوم کے ساتھ ان کا تعلق قابل رشک رہا۔ ہر کسی کو عزت وتکریم سے نوازتے اور خود بھی معزز ومکرم رہ کر دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

میرا ذہن اس بات کے لئے تیار نہیں ہو رہا کہ حضرت فانی صاحب مرحوم اب اس دنیا میں نہیں رہے' نہیں مانتا کہ فانی صاحب اب شعر نہیں سنائیں گے' کافیہ نہیں پڑھائیں گے' علمی لطائف کے جواہر نہیں بکھیریں گے' شاہ منصور ان کا آنا جانا نہیں رہے گا۔ دارالعلوم حقانیہ کے درودیوار اب فانی مرحوم سے خالی رہیں گے۔مگر کیا کروں؟ ہے تو یہ حقیقت کہ حضرت فانی صاحب اب دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ میں نے خود ان کے جنازے کی تیسری صف میں کھڑے ہو کر شرکت کی ہے مگر علامہ کا ایک شعر جو میں نے فانی صاحب سے پہلی بار سنا تھا' اپنی اور قارئین الحق کی تسلی اور اطمینان کا باعث سمجھتا ہوں۔

موت کو سمجھا ہے غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبحِ دوام زندگی

ہمارا ایمان ہے کہ فانی صاحب انتقال کر گئے ہیں' ہم بھی انکے پیچھے جانے والے ہیں' وہاں ان شاء اللہ ہماری ان سے ملاقات رہے گی۔ پھر نہ موت جیسا تلخ لفظ سننے میں آئے گا نہ فانی صاحب سے جدائی کا خدشہ واندیشہ رہے گا۔ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون اور اپنے دوستوں' طالب علموں' فانی صاحب کے رشتہ داروں' برخورداروں' دارالعلوم حقانیہ کے شیوخ اور شاعروں' ادیبوں کو یہ خوشخبری سنا کر اپنی بات ختم کردوں کہ حضرت فانی صاحب سے دائمی ملاقات کے لئے ایک ماہ کا عرصہ کم ہو گیا۔اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان اور ہم سب کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمادے۔آمین یارب العالمین

☆ ☆ ☆